

حضرت مولانا عتیق الرحمن سنبھلی لندن

سراقبال بنام ”حسین احمد“

ماضی کی ایک کہانی کا معرہ

ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب کی روشنی میں!

کتابیں لکھنے اور چھاپے جانے کی موجودہ گرم بازاری میں اگر کوئی واقعی ”کتاب“ ہاتھ آجائے تو کچھ زیادہ ہی اچھی معلوم ہونا قدرتی بات ہے۔ علامہ اقبال کے سوانح حیات میں علامہ کے فرزند ارجمند جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی ”زندہ رود“ ایک ایسی ہی کتاب کہی جانے کی مستحق ہے۔ کتاب گویا تازہ بہ تازہ نہیں مگر راقم سطور کے ہاتھ میں وہ گزشتہ دنوں ہی آئی، تین جلدوں میں ہونے کے باوجود دلچسپی کو آخر تک قائم رکھنے والی۔

برصغیر کے پڑھے لکھے لوگوں میں کم ہی ہوں گے جنہیں علامہ کی شاعری سے دلچسپی نہ رہی ہو، تھوڑی بہت راقم سطور کے حصہ میں بھی آئی اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ سمجھ لینے کی ہی بناء پر ہو سکتا تھا۔ مگر ”زندہ رود“ پڑھ لینے کے بعد جب کسی ضرورت سے کلیات اقبال کھولی تو اندازہ ہوا کہ اب بہت سے اشعار کی وہ جہیں کھل کر سامنے آئیں گی جو شاعر کی زندگی اور شخصیت سے واقفیت ہی کے نتیجے میں کھل سکتی ہیں۔ خاص کر ان کی شاعری کا جو ایک اہم موضوع ان کی اپنی ذات ہے اس سلسلہ کے اشعار کے بارے میں تو یہ کتاب بہت صاف صاف بتائے دیتی ہے کہ اپنی کسی کمزوری کی طرف علامہ نے اشارہ کیا ہے تو اس میں کسی حد تک حقیقت ہے اور کس حد تک شاعری اور کہیں جو کوئی خوبی جتنائی ہے تو اس کی واقعی حقیقت کیا ہے اس طرح اگر علامہ کے کلام میں کہیں ایسے اشعار کسی کو نظر آتے ہیں۔ جو ان کی شاعری کے عمومی مزاج سے جوڑ نہ کھاتے ہوں ایسے اشعار کا مسئلہ حل کرنے میں بھی یہ کتاب مددگار ہونی چاہیے۔ ایسے اشعار کی ایک بہت نمایاں مثال ”حسین احمد“ کے عنوان سے کلیات کی تقریباً آخری نظم ہے جو علامہ کی وفات سے کوئی دو ماہ قبل (فروری ۱۹۳۸ء میں) کہی گئی اور اس کی تکمیل سے مٹی نضا کچھ ایسی مکدر ہوئی کہ آج تک صاف نہ ہو پائی، ان اشعار کا کوئی جوڑ علامہ کی شاعری کے عمومی مزاج کے عین نفاذ کے ساتھ ہی علامہ کے عزم و مرتبہ کے ساتھ کبھی سمجھ

میں نہ آ سکا تھا۔ اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار ہوا ہے کہ یہ ”عقیدہ مشکل“ حل ہوتا نظر آیا۔ اس تحریر کا اصل مقصد اسی یافت کا اظہار و بیان ہے۔

علامہ کے یہ اشعار ہمارے مخدوم و محترم استاذ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ (م ۱۹۵۷ء) کے اس نظریہ کی تردید میں سپرد قلم ہوئے تھے کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وطنی رشتہ اتحاد کی بنا پر سیاسی نوعیت کی متحدہ قومیت کا رشتہ نہ صرف قائم ہو سکتا ہے بلکہ ملک میں تحریک آزادی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ یہ رشتہ قائم ہو۔ وہ موقع جس پر یہ اشعار سر ہوئے اس نظریے کے سلسلہ میں حضرت مولانا کے کسی تفصیلی اظہار و بیان کا نہ تھا، بس ایک تقریر کی اخباری رپورٹ تھی جو علامہ کے لئے اس طرح کے سخت ترین الفاظ میں رد عمل کو کافی ہو گئی کہ:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبست
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربست

تین شعروں کے الفاظ میں جتنی سخت باتیں سما سکتی تھیں اس کے لحاظ سے کوئی کسر یہاں نہیں رہ گئی ہے۔ تقریر اگرچہ دہلی کے ایک سیاسی جلسہ میں تھی مگر اسے ”برسر منبر“ ٹھہرایا گیا ہے اور وعظ یا تقریر نہیں ”سرود“ (بہ معنی راگ) کا نام اسے دیا گیا ہے۔ پھر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تعلق دیوبند جیسے دینی مرکز سے مندرشتی کا ہے مگر مرکز دین حضرت محمد عربی کے مقام سے واقفیت کی گویا ہوا بھی نہیں لگی۔ اور پھر آخر میں نصیحت ہے کہ دین تو تمارا حضرت محمد ﷺ کو پہچاننے کا نام ہے تم اگر ان کی ذات گرامی تک نہیں پہنچ پاتے تو پھر تمہارے حصے میں جو چیز رہی جاتی ہے وہ ”ابولہبیت“ (یعنی معاذ اللہ مصطفیٰ دشمنی) ہے۔

علامہ کے کلام میں یہ حقیقت یقیناً بے نقاب ہے کہ وہ یورپ کے پیدا کردہ وطنی قومیت کے سیاسی تخیل کو انسانیت کے لئے ایک لعنت اور خاص دین مذہب کے حق میں تو ”کفن“ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ”زندہ رود“ میں آپ کے اس فکر کی پوری تفصیلات سامنے آ جاتی ہیں۔ اس لئے یہ تو سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ علامہ جس چیز کو مذہب کا کفن جان رہے ہیں اس کی دعوت کسی قابل لحاظ اسلامی شخصیت کی طرف سے آئے تو وہ اس کی تردید میں ”ضبط سخن“ نہ کر سکیں۔ لیکن یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ حضرت مولانا مدنیؒ کا جو کہنا تھا وہ وہی تھا جس کی حضرت علامہ کے فکر اور فہم اسلام میں گنجائش نہ تھی تب بھی اس آخری درجہ کے جارحانہ انداز تردید کی توقع جس سے ان کے اظہار امدعا سے زیادہ فریق ثانی کی معلوم و معروف © rasailojaraid.com جیسے مرتبہ کی شخصیت سے نہیں

کی جاسکتی تھی۔ اشعار میں ”دیوبند“ کا حوالہ دلیل ہے کہ علامہ پر ”حسین احمد“ کی نہایت قابل لحاظ حیثیت عرفی مخفی نہ تھی۔ بلکہ یہی چیز گویا باعث ہوئی کہ وہ ان کی مبینہ تقریر پر نکتہ چیں ہوں۔ پھر آخر کیونکر یہ ممکن ہوا کہ اس تقریر کا حوالہ ”سرود بر سر منبر“ کے توہین آمیز الفاظ میں آئے؟ اور اس سے بھی بڑھ کر ”چہ بے خبرز مقام محمد عربیت“ فرماتے ہوئے علامہ یہ بھی نہ سوچیں کہ یہ وہ کس کے بارے میں فرما رہے ہیں؟ اور پھر کسے ”بہ مصطفیٰ برساں خویش“ کا سبق دے رہے ہیں وہ کہ جس نے مدتیں در مصطفیٰ پہ فقیرانہ گزاری ہیں اور جس کا دیوبند میں شغل ہی درس حدیث مصطفیٰ ہے؟ کیا یہ کہا جائے کہ عشق مصطفیٰ (ﷺ) کی جو دولت علامہ کو نصیب سے مل گئی تھی اس کے حوالے سے وہ خود بھی معاذ اللہ اسی خامی کا شکار ہوئے جس کا لگد اعظ زاہد کے بارے میں کرتے ہوئے فرما گئے ہیں۔

غرور زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

یہ علامہ کی شدت بے پناہ کے مقابلے میں محض ایک ہلکے سے شکوے کا پیرایہ ہوگا، مگر ایسا کہنا وہی پسند کرے گا جسے اندازہ نہیں یا وہ بھول گیا ہے کہ علامہ کے عشق مصطفیٰ سے قدرت نے کیا کام ان کی شاعری کے حق میں لیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر خود حضرت مولانا علیہ الرحمۃ نے علامہ کی اس سراپا آتش تنقید کے جواب میں جس پاس ولحاظ سے کام لیا ہے اس کے ہوتے ہوئے آپ کے ایک کفش بردار کو کہاں زیبا کہ وہ کوئی الگ راہ چلے؟ علامہ کی اٹھائی ہوئی اس بحث کے سلسلہ میں ”متحدہ قومیت اور اسلام“ کے عنوان سے جو ایک مقالہ حضرت والا نے اس موقع پر تحریر فرمایا وہ مکمل ہونے نہ پایا تھا کہ علامہ نے وفات پائی اس ناگہانی خبر کے حوالہ سے اس مقالہ کی تمہید میں رقم طراز ہوئے ہیں:

”..... جب کہ میں قومیت کی لفظی بحث کے اختتام پر پہنچ کر مقصد اصلی سے نقاب اٹھانا چاہتا تھا ناگاہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کے وصال کی خبر شائع ہوئی۔ اس نامرز او دلگداز خبر نے خیالات و عزائم افکار پر صاعقہ کا کام کیا۔ طبیعت بالکل بجھ گئی اور عزائم فسخ ہو گئے۔“

پھر آئندہ صفحہ پر یہ کہنے کے لئے کہ ڈاکٹر اقبال صاحب اگرچہ مجھ سے اس درجہ فائق و برتر تھے کہ میں گویا ان کے سامنے طفل ابجد خواں مگر ہندوستانی سیاست کے مسئلہ میں ساحرانِ فرنگ کے سحر کا شکار ہو گئے تھے۔ اور ہوتا ہے کہ بعض دفعہ بڑے غلطی کر جاتے جبکہ چھوٹے محفوظ رہتے ہیں فرمایا کہ:

”یہ امر یقینی اور غیر قابل انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے۔ وہ وہ آسمانِ حکمت و فلسفہ، شعر و سخن، تحریر و تقریر، دل و دماغ اور دیگر کمالات علمیہ اور عملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔ مگر باوجود کمالات گوں ناگوں ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا

برہدف برزند تیرے

گاہ باشد کہ کوکب ناداں

(کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نادان بچہ کا تیر نشانہ پر بیٹھ جائے)

اے کاش علامہ اپنے ہدف کے اس رد عمل کو دیکھنے کے لئے زندہ رہے ہوتے! یہ راقم نہیں سمجھتا کہ مرحوم علامہ نے یہ تحریر پڑھی ہوتی تو اس بے نفسی اور خاک ساری کے لئے اپنی زندگی کا کوئی ایسا دوسرا تجربہ وہ یاد کر پاتے۔ اور یقین کیا جاسکتا ہے کہ علامہ کے ساتھ ”سر“ کا برطانوی خطاب اگر نہ لگا ہوتا تو متحدہ قومیت کی بابت آپ کی رائے میں برطانوی محرک کا دخل سمجھنے کی بات بھی ہمیں حضرت والا کی اس عبارت میں نہ ملتی۔

الغرض اگر حضرت مولانا قومیت کا وہ نظریہ پیش کر رہے ہوتے جو حضرت علامہ کے فہم اسلام سے سیدھا ٹکراتا تھا تب بھی اس پر رد عمل کا یہ پیرایہ اظہار کہ مسند نشین دیوبند کو بیک جنبش قلم ”بولہسی“ تک پہنچا دیا جائے یہ علامہ سے کسی قدر کم درجہ کی فہمیدہ و سنجیدہ شخصیت سے بھی باسانی سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی! لیکن مولانا کی تقریر کو تو فی الواقع دور کا بھی تعلق اس بات سے نہ تھا جو حضرت علامہ کو اس قدر ناگوار گزری علامہ جس وطنی قومیت کو ”مذہب کا کفن“ سمجھتے تھے مولانا بھی اسے ایسا سمجھنے میں علامہ سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بہر حال نہ تھے۔ مگر لگتا ہے کہ معاملے کے ایک خاص پس منظر کی بناء پر علامہ کو اپنا ہی بیان کردہ یہ نکتہ فراموش ہو گیا تھا کہ

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں داناں

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

وہ تحریک خلافت جس سے ”زندہ رود“ کے بیان کے مطابق علامہ دور اور نفور رہے اور جس میں حسین احمد کا مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کے ساتھ وہ جانبازانہ حصہ تھا جس کی تفصیل کے لئے ان لوگوں پر چلائے گئے مقدمہ کراچی (۱۹۲۱ء) کی روداد پڑھنی چاہیے۔ یہ اس اسلامی خلافت کو بچانے کے لئے ہی اٹھائی گئی تحریک تو تھی جس کا از روئے وطن ہندوستانی مسلمانوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں اسلامی رشتہ ان کا اس کے ساتھ تھا جو جغرافیائی حدود قیود سے بالاتر ہے۔ اور یہ خلافتی جدوجہد اسی متحدہ قومیت کے ساتھ تھی جس کا حوالہ مولانا مدنی کی زیر بحث تقریر میں آیا۔ کون نہیں جانتا کہ اس تحریک نے مہاتما گاندھی کو اپنی سربراہی کے لئے قبول کر لیا تھا۔ اور ایسا ہونے میں ”حسین احمد“ سے کہیں زیادہ حصہ مولانا محمد علی جوہر کا تھا جن سے برتر اسلامیت کا دعویٰ شاید علامہ اقبال کو کبھی نہ ہوا ہو یہی وہ ”متحدہ قومیت“ تھی جس کا حوالہ مولانا اپنی تقریر میں دے رہے تھے نہ کہ وہ جو علامہ کے تصور میں تھی جس میں مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا۔

حضرت حسین احمد کے جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ کی سیاسی زندگی ۱۹۱۷ء سے شرع ہوتی ہے جبکہ خلافت عثمانیہ کے باغی شریف حسین نے ان کو اس کے تحت مستند شیخ ہند مولانا محمد حسن کے ساتھ گرفتار کر کے

انگریزوں کے حوالے کیا اور پھر انگریزوں نے ان کو اپنی حکومت کے خلاف باغیانہ عزائم کے حوالے سے جزیرہ مالٹا میں چار سال قید رکھا۔ چار سال بعد ۱۹۲۰ء کے شروع میں ان حضرات کی رہائی عمل میں آئی۔ شیخ الہند کی یہ گرفتاری بے وجہ نہ تھی، یہ جنگ عظیم اول کا زمانہ تھا کہ آپ برطانوی حکومت کے خلاف ایک مکمل باغیانہ اسکیم لے کر ہندوستان کے باہر نکلے تھے، حجاز مقدس کو اولین منزل بنایا اس لئے کہ وہاں حج کے زمانہ میں ان میں سے بیشتر لوگوں سے رابطہ آسان ہو سکتا تھا جن سے اپنی اسکیم کا سلسلہ میں رابطہ مطلوب تھا۔ اور اس فہرست میں سب سے پہلے ترکی حکام تھے جن سے رابطہ ہوا بھی، مگر قسمت سے اسی زمانہ میں شریف مکہ حسین پر انگریزوں کے ذورے کا کر گئے اور حجاز مقدس خلافت کے اقتدار سے نکل گیا۔

مارچ ۲۰ء میں شیخ الہند رہا ہوئے تو بڑھاپے اور قید کے شداوند نے زار و زار کر دیا تھا۔ نومبر ہی میں آپ کی شمع حیات گل ہو گئی، اور پھر برطانوی حکومت کے خلاف آپ کے مشن کی علمبرداری ”حسین احمد“ کے حصہ میں آئی۔ اسیران مالٹا نے جب رہائی پائی تو اسے پہلے خلافت تحریر شروع ہو چکی تھی۔ اور یہ صرف مسلمانوں کی نہیں تمام ہندوستانیوں کی تحریک بن گئی تھی جس میں ہندو اکثریت کے سب سے بڑے نمائندہ مہاتما گاندھی پیش پیش تھے۔ شیخ الہند جن کا تحریک خلافت کی پوری مسلم قیادت نے مع گاندھی جی کے بمبئی پہنچ کر نہایت پر جوش استقبال کیا تھا، اس تحریک کے لئے سب سے بڑی اسلامی اتھارٹی کے حامل مانے گئے۔ اور آپ نے اس متحدہ تحریک اور اس کے پروگرام عدم موالات (نان کو اپریشن) پر مہر تصویب ثبت فرمائی۔ اسی پر عمل درآمد کے نتیجے میں ”حسین احمد“ پر مولانا محمد علی وغیرہ کے ساتھ بغاوت کا مشہور مقدمہ کراچی چلا۔ اور دو دو سال کی جیل ہوئی۔

یہ ہے حسین احمد کے اس نظریہ متحدہ قومیت کا پس منظر جس کا آپ کی ۳۸ء کی اس تقریر میں حوالہ ایک طوفان اٹھا گیا۔ یعنی یہ وہی متحدہ قومیت تھی جس کے جھنڈے کے نیچے تحریک خلافت کے دور میں علامہ اقبال اور مسٹر محمد علی جناح جیسے خال خال افراد کو چھوڑ کر مسلم ہندوستان کی وہ تمام ہستیاں سرگرم رہی تھیں جن کی طرف ملی مسائل کے لئے لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں۔ علامہ اقبال ”حسین احمد“ سے کچھ زیادہ واقف ہوں یا نہ ہوں متحدہ قومیت والی بات کے اس پس منظر سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ تحریک خلافت سے ان کے بے تعلق رہنے کی تو ایک اہم وجہ یہی تھی مگر یہ دینی حوالے سے تھی ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

قیام انگلستان کے دوران جب وہ (دہلی) انقلاب سے گزرے اور انہی ایام میں برصغیر میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا تو اقبال سرسید احمد خان کے سیاسی مکتبہ فکر کو درست خیال کرتے ہوئے دہلی و قلبی طور پر اس سے وابستہ ہو گئے۔ سرسید کے سیاسی مکتبہ فکر کی منطق یہ تھی کہ..... جمہوریت کے ذریعہ قومیت متحدہ کی بنیاد جمی رکھی جاسکتی تھی جب ہندو مسلم اور مرکزی حکومت میں ہر ایک کے حصہ دار ہوں، لیکن فرقہ وارانہ منافرت کے

سبب ہندو ایسی صورت کو قبول کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ پس برصغیر میں قومیت متحدہ کا تخیل خیال خام تھا۔ (زندہ رود۔ جلد سوم صفحہ ۲۹۱-۹۲)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں اصولاً متحدہ قومیت سے انکار نہ تھا۔ نمائندگی میں برابری کی شرط کے ساتھ وہ منظور تھی۔ پس علامہ کے اس سیاسی فکر و عقیدہ کے بے شک یہ حق تھا کہ کوئی آواز اس شرط کے بغیر متحدہ قومیت کے حق میں بلند کی جا رہی ہو تو اسے چیلنج کریں۔ مگر اس کے لئے سیاسی زبان کی بجائے یہ دینیات کی زبان کا سوال کیونکر پیدا ہو گیا؟ اور وہ بھی ایک اعلیٰ درجہ کے مستند و مسلم عالم دین کے مقابلے میں! جب کہ علامہ اسلامی دینیات پر کتنا بھی عبور اپنے مطالعہ کی بنیاد پر رکھتے ہوں مگر ان جیسے ذی فہم کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس عبور کو باضابطہ تحصیل کا ہمسر سمجھتے ہوں گے۔ اور اگر سمجھتے بھی ہوں تب بھی جو عزم و پند آرمیز لہجہ انہوں نے اس چیلنج میں اختیار فرمایا وہ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ضرور اس کے پس منظر میں کچھ خاص حالات و معاملات ہونے چاہئیں۔ ورنہ یہ علامہ کے مقام سے فروتر بات تھی اور قطعاً غیر متوقع بات تھی۔ ”زندہ رود“ نے انہیں خاص حالات سے پردہ اٹھانے کا کام انجام دیا ہے۔

کم سے کم راقم سطور کے علم میں اس سے پہلے نہ تھا کہ حضرت علامہ نے برصغیر کی سیاست میں کوئی سرگرم عمل حصہ بھی لیا، کل ہند مسلم لیگ کی سیاست سے ان کا عملی تعلق صرف ۱۹۳۰ء کے خطبہ صدارت الہ آباد کی حد تک معلوم تھا۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ ۱۹۲۶ء میں جب علامہ نے لاہور سے پنجاب صوبائی کونسل کا انتخاب لڑا تب سے مسلم لیگ سے ان کی وابستگی جو پہلے بس فکری درجہ کی تھی سرگرم عملی وابستگی میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ اور اس رشتہ کی یہ سرگرمی ٹھینھ سرسید مکتب فکر والی لائن پر تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں جب برطانوی حکومت نے سائنس کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا جس کو ہندوستان کے لئے آئندہ دستوری اصلاحات کے بارے میں سفارشات پیش کرنا تھیں اور اس کمیشن میں تمام کے تمام انگریز تھے ایک بھی ہندوستانی کو نہیں لیا گیا تھا۔ تو اس پر کانگریس نے اس کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ مسلم قائدین میں خود مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کا یہی فیصلہ تھا، مگر اقبال اس کے برعکس اپنے صوبائی صدر سر محمد شفیع کے ساتھ اس کمیشن کے تعاون کے لئے اس حد تک گئے کہ مسلم لیگ، جناح لیگ، اور شفیع لیگ کے دو گلوں میں بٹ گئیں۔ اور یہ دونوں لیگیں پبلک سطح پر ایک دوسرے سے متصادم ہوئیں۔ چنانچہ جب مسٹر جناح نے دوسرے مسلم لیڈروں کے ساتھ مل کر ایک بیان کمیشن کے مقاطعہ کے لئے شائع کیا تو اس کے رد عمل میں علامہ اقبال نے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ ایک بیان دیا جس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا تھا کہ:

”ہم نہایت جرأت اور زور سے کہتے ہیں کہ ہم کراہیہ کے ٹو بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اڑا لیا ہے کہ ہم اس کے برعکس یہ

کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جاسکتیں.....“ (صفحہ ۳۳-۳۴)

پنجاب مسلم لیگ جس کے علامہ صاحب سیکرٹری تھے اور سر محمد شفیع صدر اس کی اس روش پر مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ہمدرد میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ”سر محمد شفیع سے بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کسی وائسرائے کی رائے سے ہم رائے نہ ہوں۔ انہوں نے وفاداری کا راگ گانا شروع کر دیا ہے۔ پنجاب کی بد قسمتی ہے کہ سر محمد اقبال جیسے لیڈر سر محمد شفیع جیسے وفادار کو اپنی آزاد خیالی کی سطح تک ابھار کر نہ لاسکے بلکہ برخلاف اسکے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی سر محمد شفیع کی وفاداری کی پست سطح پر اتر آئے ہیں۔ چنانچہ کمیشن کے متعلق پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کا بیان اسکے صدر کے بیان سے کہیں زیادہ چالپوسی کا ہے۔“ (ص ۳۳)

علامہ صاحب اس درجہ کامل ”سرسیدی“ تو ڈاکٹر جاوید اقبال کے صریح بیان کے مطابق تھے ہی اس پر مزید یہ کتاب یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ وہ برصغیر کے معاملات کو ایک حد تک پنجابی صوبائیت (یا کہیے علاقائیت) کی سطح سے دیکھنے والوں میں بھی شامل ہو گئے تھے۔ سائنس کمیشن کے بارے میں ان کے جس بیان کے آخری فقرے اوپر نقل کئے گئے ہیں اسی بیان میں ہے کہ:

”جن مسلمانوں نے مسٹر جناح کے اعلان پر دستخط کئے ہیں ان میں سے بعض تو ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں مسلمان ~~تک~~ ٹٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ ان کی روش پنجاب اور بنگال ایسے صوبوں کے مسلمانوں کی حکمت عملی کو تبدیل یا وضع نہیں کر سکتی۔“ (ص ۳۴)

اسی طرز فکر کا اظہار ان کے مسٹر محمد علی جناح کے نام ایک خط سے بھی ہوتا ہے جو ۲۱/ جون ۱۹۳۷ء کو لکھا بتایا گیا ہے اس خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”..... میرے خیال میں نیا آئین ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بنا پر حد درجہ یاس انگیز ہے ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا۔ یعنی مسلم صوبوں پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام..... میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔“ (ص ۳۲۸) (نوٹ: آخری جملہ کو انڈر لائن کیا جانا یہ راقم کی طرف سے ہے)

کیا یہ طرز کلام انہیں علامہ اقبال کا ہو سکتا ہے جنہیں ہم ”عشق کے درد مند“ کے طور پر جانتے آئے تھے؟ اور جن کی آفاقیت نے کہا تھا:

درویش خداست ، نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر © rasailojaraid.com

نیز ارشاد ہوا تھا:

تو ابھی رہ گزر میں ہے، قیدِ مقام سے گزر
مصروفِ حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر

نہیں یہ دراصل ان کے اندر ۱۹۲۷ء سے پروان چڑھنے والی ایک نئی شخصیت کا ظہور تھا، جو ۳۷ء کے اس معرکہ انگیز سال میں اپنے کمال کو پہنچ گئی نظر آتی ہے، جس میں انڈیا ایکٹ ۳۵ء کے ماتحت ہونے والے ایکشن کے بعد یوپی کی وزارت سازی کے مسئلہ پر لیگ اور کانگریس کے درمیان کبھی نہ پٹنے والی خلیج پیدا ہوئی اور محمد علی جناح بھی سرسید والے دو قومی نظریے کو اپنانے کی طرف چل پڑے اور یہ ۳۷ء وہ سال تھا کہ علامہ کی ۳۴ء سے شروع ہونے والی علالت اپنی آخری حدیں چھوئے لگی تھی اور بالآخر اپریل ۳۸ء میں شمعِ حیات ہی ٹل کر گئی۔ زندگی کے اس مرحلے میں علامہ کے لئے یہ صورتحال کس قدر تسکین بخش رہی ہوگی کہ وہ اپنے جیتے جی مسٹر محمد علی جناح کو فکری طور پر وہیں پہنچتا ہوا دیکھ رہا تھے جہاں ان کو پہنچانے کے لئے وہ ۱۹۲۷ء سے کوشاں ہوئے تھے۔ ایسے میں ناگاہ ان کے کان میں آواز آتی ہے کہ مسند آرائے دیوبند مولانا حسین احمد مدنی اس دو قومی نظریہ کی راہ میں حائل ہونا چاہتے ہیں تب۔ اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے..... ان کا اس پر یہ بھڑک اٹھنے والا انداز کچھ غیر متوقع نہیں رہتا۔ آخر کو انسان تھے۔

صحت کے اعتبار سے علامہ کے ضعف کا یہ عالم بھی یہاں ملحوظ رہے کہ فروری میں کہے گئے ان اشعار کے سلسلہ میں چھڑ جانے والی بحث پر جب علامہ نے اپنی بات مدلل کرنے کے لئے ایک مفصل بیان کی ضرورت سمجھی تو خود اس قابل نہ تھے کہ اس کو لکھ سکیں، بلکہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیان کے مطابق یہ کام ان کے خاص معاونین، چودھری محمد حسین وغیرہ نے انجام دیا (ص ۳۶۸) اور خود اشعار بھی اپنے معنوی پہلو سے اس گواہی کے لئے کم نہیں کہ علالت کے اثرات ایسے ہی غیر معمولی درجہ پر پہنچ چکے تھے۔ ورنہ اگر کسی نے ”ملت از وطن است“ کا سرود ”بر سر منبر“ الاپنے کا ارتکاب کیا بھی تھا تو ”مقامِ محمدؐ“ کی معرفت تو بہت آگے کی چیز یہ تو اس شخص کے دین محمدؐ کی الف باتا سے بھی بے خبری کی دلیل ہے۔ پھر یہاں کیا محل کہ مقامِ محمدؐ سے بے خبری کی طعن کی جائے؟ اور وہ کہ جو دین مصطفیٰ ﷺ کی الف باتا سے بھی بے خبر پایا جا رہا ہوا ہے کیا سمجھ آئے گی کہ یہ ”مصطفیٰ برساں خویش را“ میں علامہ نے کیا فرمایا؟ مگر چونکہ علامہ کے یہاں اصل دین اور دینداری حضرت محمد ﷺ سے جذباتی تعلق ہے، جیسا کہ ان کی شاعری سے عیاں ہے۔ اور اسی کو جناب رشید احمد صدیقی مرحوم

نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ ”اقبال پر دنیا کے بڑے مذہب کی گرفت اتنی نہیں جتنی ایک بڑی شیطنت کی ہے۔“ (اور اسی سے ان کی ان عملی دینی کمزوریوں کا عقدہ حل ہو جاتا ہے جو کچھ ایسی راز بھی نہ تھیں اور ڈاکٹر جاوید نے تو ان کو اس درجہ کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اچھا تھا اگر وہ یہ نہ کرتے۔) پس ان اشعار کے معنوی پہلو کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انحطاط قویٰ کے اس عالم میں جب علامہ نے ”ملت از وطن است“ کے ”سرد“ پر گرفت کے ارادہ سے قلم اٹھایا تو وہ موقع محل کی رعایت کرنے کی بجائے بے ساختہ اسی راہ پر رواں ہوا جس کا وہ عادی تھا۔

الغرض علامہ ان اشعار کی تسوید کے وقت جن خاص حالات کے ماحول میں اور صحت کی جس منزل میں تھے اس کے پیش نظر ان کا یہ غیر متوقع کلام کچھ ایسا ناقابل فہم نہیں رہتا۔ صد شکر کہ علامہ کو انتقال سے پہلے اس کا موقع میسر آ گیا کہ اس قضیہ نامرضیہ کی وراثت چھوڑ کر نہ جائیں۔ حضرت مولانا کی طرف سے کی گئی ایک وضاحت آپ تک پہنچی جس کے حوالہ سے یہ اعلان اخبارات میں چھپوایا کہ اس کے بعد مولانا پر اعتراض کا کوئی حق انہیں نہیں رہتا۔ مگر افسوس آپ کے لوگوں نے آپ کے بعد آپ کا جو مجموعہ کلام ”ارمغان حجاز“ چھپوایا تو اس میں ان اشعار کو شامل کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ زندہ رود میں اس سوال کا جواب بھی آیا ہے۔ اور اس سے ان ”خاص حالات“ کے غیر معمولی اثرات کی مزید توثیق ہوتی ہے جن کے حوالہ سے علامہ کے بالکل غیر متوقع طرز کلام کی توجیہ ممکن ہوئی۔ علامہ کے رجوع کے بعد ان اشعار کو ان کے نامہ اعمال میں برقرار رکھنے کا جواز بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مولانا نے بعد میں ”متحدہ قومیت اور اسلام“ کے نام سے جو رسالہ چھاپا وہ وضاحت کے برعکس تھا پھر اس میں علامہ کی توہین کرتے ہوئے انہیں ساحرانِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا قرار دیا گیا اور ”کودک ناداں“ کے لقب سے نوازا گیا۔ (ص ۳۷۰) ”اس بیان جواز میں صرف یہی نہیں ہے کہ ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں آ جانے کی جو بات حضرت مولانا نے محض ایک بشری کمزوری کے طور پر کہی تھی جو کسی بھی شخص کو لاحق ہو سکتی ہے اسے طنز و ملامت پر محمول کر لیا گیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ”کودک ناداں“ والا شعر جو صاف طور پر حضرت مولانا نے ازراہ عجز و انکسار اپنے حق میں لکھا ہے اسے علامہ کے حق میں پڑھ لیا گیا۔ حالانکہ ”زندہ رود“ پڑھ کر کسی ایسے شبہ کی ادنیٰ گنجائش نہیں رہتی کہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی اردو فارسی اتنی کمزور ہو۔ تو پھر اس برعکس فہم کی ذمہ داری کے لئے نظر سوائے مسلم لیگ اور کانگریس کی ہوشربا کٹکٹش والے ان حالات کے اور کس طرف جائے جو میسر جناح سے مولانا آزاد کو ”شوبوائے“ کہلوا دیں اور علامہ کی زبان پر شیخ دیوبند کے لئے

”بویسی“ کی وعید جاری کرادیں۔

اس تحریر کا اصل مدعا تو پورا ہو گیا۔ یوں اور کافی باتیں اس میں ایسی ہیں کہ نقل کر دینے کی گنجائش ہو تو سب کام کی۔ تاہم ان میں ایک دو جو موجودہ مادیت اور زر پرستی کے دور میں ”قتدیل رُہبانی“ کا سا منظر پیش کرتی ہے۔ ان کی گنجائش تو نکالنی ہی چاہیے۔ شاید ہم میں سے کچھ لوگوں کے دل ان میں پوشیدہ نصیحت سے جاگ پڑیں کہ بہت اندھیری چھائی ہے اور یہ نصیحت علامہ کی شاعری کے خاص موضوعات میں سے بھی ہے۔

علامہ کے سفر افغانستان کے حوالہ سے وہاں کی معروف شخصیت ملا شوز بازار کے یہاں حاضری کا جو ذکر آیا ہے تو بے تاج بادشاہی کا درجہ رکھنے والی اس شخصیت کے مکان کی کیفیت بھی قابل ذکر پائی گئی۔ لکھا ہے کہ وہ ”ایک تنگ گلی کے اندر تھا اور ہر قسم کے تزک و احتشام اور ظاہری آراستگی سے خالی۔ باقاعدہ نشستگاہ بھی نہ تھی نہ زنہ مکان تھا جہاں پردہ کر کر ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ انہیں ایک لمبے کمرہ میں لے جایا گیا جس میں ایک طرف ایک پلنگ بچھا تھا اور باقی زمین پر سادہ فرش بچھا تھا۔“ (ص ۲۳۶)

علامہ کو ان کی زندگی کے آخری سالوں میں علالت کے ساتھ ساتھ معاشی پریشانی نے بھی گھیر لیا تھا۔ آپ کے دوست اور قدرداں سر اس مسعود (وزیر تعلیم ریاست بھوپال) کی کوشش سے ریاست سے آپ کے لئے پانسو روپے ماہوار تاحیات کا وظیفہ منظور ہوا۔ سر اس مسعود نے اس کی اطلاع کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ وہ کوشاں ہیں کہ بھوپال کے علاوہ حیدرآباد، بھوپال اور وغیرہ بھی ان کے لئے وظیفے جاری کریں۔ اس کے جواب میں علامہ کا خط نقل کیا گیا ہے۔

”آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔“ (ص ۳۷۸)